ADVANCE SOCIAL SCIENCE ARCHIVE JOURNAL
Available Online: https://assajournal.com
Vol. 04 No. 01. July-September 2025.Page#.2144-2153
Print ISSN: 3006-2497 Online ISSN: 3006-2500
Platform & Workflow by: Open Journal Systems

Apparent Contradictions in the Verses of the Horizons and the Self: Objections and Responses

آیاتِ آفاق وانفس میں بظاہر تعارض :اعتراضات وجوابات

Hafiz Muhammad Asghar Shakir
M. Phil Islamic Studies, Government College University Faisalabad, Pakistan,
mirzaasghar840@gmail.com
Dr. Mahmood Ahmad (Corresponding Author)
Assistant Professor, Department of Islamic Studies, Government College University Faisalabad, Pakistan,
mahmood.ahmad@gcuf.edu.pk

Abstract
This paper addresses the objections raised against Qur'anic verses related to Āyāt al-Āfāq wa al-Anfus (Signs in the horizons and within the self), which are often claimed to present internal contradictions or inconsistencies. Through a detailed analysis of selected verses and classical as well as modern exegetical sources, the article explores how these objections stem from misinterpretations, selective readings, or a lack of contextual understanding. It highlights how the Qur'an presents a holistic vision of divine signs that reinforce faith through reflection on both the external universe and the inner human reality. The study concludes that there is no real contradiction in these verses; instead, they represent complementary perspectives on divine reality, each reinforcing the other in demonstrating the oneness, wisdom, and power of Allah.

Keywords: *Qur'anic Signs, Āyāt al-Āfāq, Āyāt al-Anfus, Qur'anic Exegesis, Apparent Contradictions, Islamic Theology, Divine Revelation, Contextual Interpretation, Objections on the Qur'an, Tafsir*

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آخری کتاب کی صداقت وحقانیت پر جو دلائل دیے، ان میں سے ایک اہم دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید ہر قسم کے تضاد اور اختلاف سے پاک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا“[1]

”تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے اور اگر یہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو یقیناً یہ اس میں بہت سے اختلافات پاتے“

جو بھی قرآن مجید میں تفکر و تدبر کرے گا تو قرآن مجید کے اس دعویٰ کی صداقت اس پر واضح سے واضح تر ہوتی چلی گئی۔ قرآن مجید کا تناقض اور اختلاف سے پاک ہونا ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس کا انکار کوئی بھی انصاف پسند آدمی نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں زبان وادب کے مختلف اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی قرآنی اسالیب کی ان نزاکتوں سے واقف نہ ہو یا الفاظ کی حقیقت تک رسائی نہ رکھتا ہو یا نسخ کی حقیقت سے ناآشنا ہو تو ممکن ہے وہ بعض مقامات میں تضاد کی کیفیت محسوس کرے جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہو گا۔

[1] النساء:۸۲

زمین کی تخلیق پہلے ہوئی یا آسمان کی؟:

زمین و آسمان کی تخلیق سے متعلق ایک مقام پر فرمایا:

"ہُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًاق ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰہُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ"[2]

"وہ وہی تو ہے جس نے جو کچھ زمین میں ہے تمہارے فائدے کے لیے پیدا کیا۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں سات آسمان بنا دیا"

اس آیہ کریمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ زمین پہلے بنی اور آسمان بعد میں جبکہ ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

"وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِکَ دَحٰہَا"[3]

"اور اس نے زمین کو اس کے بعد بچھایا"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے زمین کی تخلیق آسمان کے بعد ہوئی جبکہ قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی۔ زمین فرش کی طرح اور آسمان چھت کی طرح ہے تو فرش پہلے بنتا ہے اور چھت بعد میں۔ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ نوعیت کا بیان ہے۔ دَحْو سے مراد زمین کی تخلیق نہیں ہے بلکہ اسے بچھانا ہے یعنی زمین کا مادہ پہلے پیدا کیا اور اسے موجودہ حالت میں بچھایا آسمان کی تخلیق کے بعد۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں:

"لأ جرم الارض تقدم خلقہ خلق السماء و اما دحوها فمتاخر"[4]

"زمین کے مادے کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی اور اس کا پھیلاؤ اس کے بعد ہوا"

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"قیل ان الدحی کان بعد خلق السموات و الارض رواہ علی ابن ابی طلحة عن ابن عباس"[5]

"اور ایک قول یہ ہے کہ زمین کو پھیلایا آسمان کے بعد گیا۔ اسے علی ابن ابی طلحہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے"

یعنی زمین بنی آسمان سے پہلے ہے اور اسے پھیلایا آسمان کے بعد گیا ہے۔ حضرت ابن عباس اس تناظر میں فرماتے ہیں:

"خلق اللہ الارض بأقواتها من غیر ان یدحوها قبل السماء"[6]

"کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو اس کی خوراکوں کے ساتھ بغیر پھیلائے آسمان سے پہلے پیدا کیا"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی لیکن اسے پھیلایا آسمان کے بعد گیا۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ علّامہ عزالدین عبدالسلام کی رائے یہ ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہی ہوئی لیکن ان میں اونچ نیچ بہت تھی:

"فازال التفسر لیس بعد بناء السماء و اما خلقها فکان قبل خلق السماء"[7]

"تو اس کی اونچ نیچ آسمان کی تخلیق کے بعد درست ہوئی اور زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہی ہوئی"

اور اس کا ایک جواب یہ بھی دیا گیا ہے: والارض ذلک دحھا میں بعد مَعْ کے معنی میں ہے جیسے ایک مقام پر ایک سرکش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

"عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ"[8]

"اور اس کے ساتھ وہ بد اصل بھی ہے"

یعنی اس میں پہلی بیان کردہ برائیاں بھی ہیں اور یہ بھی ہے۔ ایسے ہی پہلے اللہ تعالیٰ نے آسمان کی تخلیق کا ذکر کیا اور اس تناظر میں اپنی نعمتیں یاد دلائیں اور پھر فرمایا: والارض بعد

---

[2] البقرہ: ۲۹

[3] النازعات: ۳۰

[4] زمخشری، ابو القاسم محمود بن عمر، تفسیر الکشاف، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ج ۱، ص ۱۵۳

[5] الدمشقی، اسماعیل بن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، القاہرہ، دار الحدیث، ج ۱، ص ۶۵

[6] مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری، کوئٹہ، مکتبہ رشیدیہ، ج ۱، ص ۵۵

[7] عبدالسلام عزالدین، الفوائد فی مشکل القرآن، مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ص ۱۵۶

[8] القلم: ۱۳

ذلک دحٰھا۔ کہ اس کے ساتھ ساتھ ہم نے زمین کو پھیلانے کا بھی انعام کیا۔ اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہو جاتی ہے۔

زمین و آسمان کتنے دنوں میں بنے؟:

اس سوال کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں اختلاف ہے۔ کہیں فرمایا گیا کہ زمین و آسمان چھ دنوں میں بنے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"وَہُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ"[9]

ا"ور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا"

اور یہی بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر فرمائی گئی بالخصوص درج ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:

"الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَا فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِہٖ خَبِیْرًا"[10]

"ہُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِط یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْہَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْہَاط وَہُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ"[11]

جبکہ ایک اور مقام پر فرمایا:

"خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَہٗٓ اَنْدَادًاط ذٰلِکَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ وَجَعَلَ فِیْہَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِہَا وَبٰرَکَ فِیْہَا وَقَدَّرَ فِیْہَآ اَقْوَاتَہَا فِیْٓ اَرْبَعَۃِ اَیَّامٍط سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ۔ ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَہِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَہَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْہًاط قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ ۔فَقَضٰہُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ"[12]

"اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دنوں میں بنایا۔ اور اس نے زمین میں جمے ہوئے پہاڑ پیدا کیے جو اس کے اوپر ابھرے ہوئے ہیں اور اس میں برکت ڈال دی اور اس میں توازن سے غذائیں پیدا کیں۔ یہ سب کچھ چار دن میں ہوا۔ پھر اس نے دو دن میں سات آسمان بنائے"

ان آیات سے یہ استدلال کرنا کہ زمین و آسمان آٹھ دنوں میں بنے، ایک بے دلیل بات ہے۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو دنوں میں زمین بنائی اور دو دنوں میں اس میں انسانی ضروریات کی چیزیں اور خوراک پیدا کی۔ یہ سب چیزیں چار دنوں میں ہوئیں پھر اس نے دو دنوں میں آسمان بنائے۔ تو یہ سب کچھ چھ دنوں میں ہی بنا اور دوسری آیات میں بھی یہی فرمایا گیا فی اربعۃ ایام سے مراد زمین اور اس کی ضروری اشیا کے ٹوٹل دن ہیں اور وہ چار ہیں جیسے کوئی کہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو چار سال کی عمر میں مکتب میں داخل کروایا اور چھ سال کی عمر میں سکول میں داخل کروایا تو یہاں چھ سال کی عمر ٹوٹل عمر ہے۔ ایسے ہی فی اربعۃ ایام زمین اور اس کی ضروری اشیاء پیدا کرنے کے کل دن ہیں۔

امام نسفیؒ فرماتے ہیں:

"تقول سرت من البصره الى بغداد فى عشرة و الى الكوفة فى خمسة عشر اى فى تتمة فى خمسة عشر"[13]

"تو کہتا ہے کہ میں بصرہ سے بغداد دس دن میں پہنچا اور کوفہ تک پندرہ دن میں تو یہاں پندرہ دن سے مراد بغداد سے کوفہ تک کی مدت نہیں بلکہ بصرہ سے کوفہ تک کی مدت ہے"

ایسے ہی فی اربعۃ ایام میں زمین اور اس کی ضروریات کی تخلیق کی کل مدت ہے اور پھر دو دن میں آسمان بنائے۔ یہ ٹوٹل چھ دن ہوئے اور یہی بات قرآن کریم میں دیگر مقامات پر صراحت سے کہی گئی ہے۔ اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام اس سے پاک ہے کہ اس میں تضاد ہو۔

سو مومن دو سو کافروں پر بھاری ہیں یا ہزار پر؟:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یٰٓاَیُّہَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِط اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِج وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا"[14]

"اے نبی (مکرم! صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) مومنوں کو جہاد کی ترغیب دیں اگر تمہارے بیس آدمی ہوں جو ثابت قدم رہنے والے ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمہارے سو آدمی ہوں تو وہ ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں گے"

---

[9] ہود: ۷

[10] الفرقان: ۵۹

[11] الحدید: ۴

[12] حم السجدہ: ۹ تا ۱۲

[13] الامام عبداللہ بن احمد نسفی، مدارک التنزیل، کراچی، قدیمی کتب خانہ، ج ۳، ص ۲۲۸

[14] الانفال: ۶۵

اس کے بعد فرمایا:

"اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ"[15]

"اب اللہ نے تم پر آسانی کر دی اور وہ جانتا ہے کہ تمہارے اندر کچھ کمزوری ہے تو (اب حکم یہ ہے کہ) اگر تمہارے ثابت قدم رہنے والے سو ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تمہارے ہزار آدمی ہوں تو وہ دو ہزار پر غالب آئیں گے"

ان آیات کے متعلق بھی تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور کہا گیا کہ پہلے کہا کہ سو مومن ہزار کافروں پر غالب آئے گا اور پھر کہا گیا کہ سو مومن دو سو پر غالب آئے گا حالانکہ آیات کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ پہلا حکم یہ تھا کہ مومن اس طرح جرأت و استقامت کا مظاہرہ کریں کہ سو مومن ہزار کافر پر غالب آجائیں، پھر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر نرمی کرتے ہوئے تخفیف کر دی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری کمزوری سے آگاہ ہے اس لیے تم پر نرمی کی جاتی ہے اور پہلا حکم منسوخ کر کے دوسرا حکم یہ دیا جاتا ہے کہ سو مومن کو دو سو کافروں پر اور ہزار مومن کو دو ہزار کافروں پر غالب آنا چاہیے۔ اس دعویٰ تضاد کا بنیادی سبب یہ غلط فہمی ہے کہ یہاں شرط کو خبر سمجھ لیا جائے جبکہ شرط خبر کے معنی میں نہیں، امر کے معنی میں ہے یعنی مراد یہ نہیں ہے کہ اگر سو ہو گا تو ہزار پر غالب آئے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر سو ہو تو اسے ہزار پر غالب آنا چاہیے اور پھر نرمی کرتے ہوئے فرمایا کہ سو کو دو سو پر غالب آنا چاہیے۔

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں: شرط معنی الامر[16] کہ یہاں شرط امر کے معنی میں ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز نہیں بلکہ پہلی آیت میں ایک سخت حکم تھا، دوسری آیت میں اسے منسوخ کر کے نرم حکم دے دیا گیا۔

غزوہ بدر میں کتنے فرشتے آئے تھے؟

اس تناظر میں ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّيْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ"[17]

"جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری پکار کا جواب دیا کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرنے والا ہوں جو لگاتار آئیں گے"

ایک اور مقام پر فرمایا:

"اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ"[18]

"جب آپ مومنوں سے فرما رہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لیے کافی نہیں کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کر دے"

پھر ارشاد ہوا:

"بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ"[19]

"کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ لوگ اچانک تم پر ہلہ بول دیں تو تمہارا رب پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد فرمائے گا"

ان آیات میں فرشتوں کی مختلف تعداد کو بھی قرآن میں تضاد کا نام دیا گیا حالانکہ یہاں ایک ترتیب کا بیان اور اللہ تعالیٰ کی پہلے سے بڑھ کر کرم فرمائی کا تذکرہ ہے۔ ان آیات کی تطبیق میں ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک ہزار فرشتے بھیجنے کا وعدہ فرمایا پھر مزید کرم فرماتے ہوئے انہیں تین ہزار کر دیا پھر یہ افواہ پھیلی کہ کرز بن جابر فہری اپنے لشکر کے ساتھ قریش کی مدد کو آرہا ہے چونکہ قریش کی تعداد مسلمانوں سے پہلے ہی تین گنا سے بھی زیادہ تھی، اس لیے لوگوں میں طبعی طور پر ایک بے چینی سی پیدا ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم صبر و تقویٰ کا مظاہرہ کرتے رہو اور وہ تم پر اچانک حملہ کر دیں تو میں پانچ ہزار فرشتے بھیج دوں گا لیکن چونکہ کرز بن جابر نہیں آیا اس لیے پانچ ہزار فرشتوں کی نوبت ہی نہیں آئی۔ البتہ تین ہزار فرشتے آئے اور دوسرا قول یہ ہے:

---

[15] الانفال: ٦٦

[16] بیضاوی، ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر، انوار التنزیل واسرار التاویل، ج ۱، ص ۳۹۲

[17] الانفال: ۸

[18] آل عمران: ۱۲۴

[19] آل عمران: ۱۲۵

"انہ امدھم اوّلا بھاثم صارت ثلاثۃ ثم صارت خمسۃ "[20]

"کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک ہزار سے مدد فرمائی پھر تین سے اور پھر پانچ ہزار سے"

امام بیضاویؒ فرماتے ہیں:

"قیل امدھم اللہ یوم بدر اوّلا بالف من الملائکۃ ثم صاروا ثلاثۃ آلاف ثم صاروا خمسۃ آلاف"[21]

اور ایک قول یہ ہے کہ بدر کے دن پہلے اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار فرشتوں سے مسلمانوں کی مدد فرمائی۔ پھر وہ تین ہزار ہو گئے۔ پھر وہ پانچ ہزار ہو گئے۔ اس سے واضح ہوا کہ ان آیات میں ایک ترتیب اور اللہ تعالیٰ کی کرم فرمائی کا بیان ہے، کوئی تضاد نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی باتیں بدلی جاسکتی ہیں یا نہیں؟:

اس تناظر میں بھی دو آیات سے حسبِ منشا استدلال کرتے ہوئے قرآن مجید میں تضاد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔

پہلی آیت ہے:

"وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ "[22]

"اور تمہارے ربّ کی باتیں سچائی اور انصاف میں مکمل ہو گئیں اور اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں"

"مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا"[23]

"ہم جب بھی کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آتے ہیں"

ان آیات سے استدلال کرتے ہوئے یہ کہنا کہ پہلی آیت میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی باتیں بدلتی نہیں اور دوسری آیت میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی باتیں بدل جاتی ہیں، حقیقت سے بالکل محروم اور انتہائی سطحی سی بات ہے کیونکہ پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن مجید ہر لحاظ سے ایک مکمل اور محفوظ کتاب ہے اور کوئی اس میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں:

"والمراد بالکلمۃ القران أی تم القرآن فی کونہ معجزا دالا علی صدق محمد"[24]

"یہاں کلمہ سے مراد قرآن مجید ہے یعنی قرآن مجید اپنے معجزہ ہونے اور رسول کریم کی صداقت پر دلیل ہونے میں مکمل ہو گیا"

جبکہ دوسری آیت سے مراد نسخ ہے، جس سے مراد ایک حکم شرعی کا دوسرے حکم شرعی سے بدلنا ہے جیسے مریض کی حالت بدلنے سے طبیب اس کی دوا تبدیل کر دیتا ہے۔ ایسے ہی جیسے جیسے لوگوں میں دین پختہ ہوتا گیا، اللہ تعالیٰ نے کچھ احکام بدل دیے جیسے پہلے صرف شراب کا نقصان واضح کیا گیا لیکن اسے حرام قرار نہیں دیا گیا۔ جب لوگوں میں دین راسخ ہوا تو شراب کو حرام قرار دے دیا گیا۔ ایسے ہی کسی سخت حکم کو نرم حکم سے بدل دیا گیا جیسے پہلے حکم تھا کہ سو مومن ہزار کافروں پر غالب آئیں اور پھر نرمی کرتے ہوئے فرمایا کہ سو مومن دو سو مومنوں پر غالب آئیں۔[25]

تو نسخ کو کلمات کی تبدیلی قرار دینا علوم قرآنی سے مکمل ناواقفیت کی دلیل ہے اور ان آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز موجود ہی نہیں۔

ابلیس جنّ تھا یا فرشتہ؟:

مندرجہ ذیل دو آیات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ قرآن کریم کے بیان میں اس سوال کے جواب میں تضاد ہے کہ ابلیس جنّ تھا یا فرشتہ۔ پہلی آیہ کریمہ یہ ہے:

"وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ "[26]

"اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا"

---

[20] سیوطی، جلال الدین، تفسیر جلالین، کراچی، قاسم پبلی کیشنز، ۱۴۲۸ھ، ج ۱، ص ۲۶۵

[21] بیضاوی، ناصر الدین ابو سعید عبداللہ بن عمر، انوار التنزیل واسرار التاویل، ج ۱، ص ۱۸۳

[22] الانعام: ۱۱۵

[23] البقرہ: ۱۰۶

[24] تفسیر الکبیر، ج ۱۳، ص ۱۶۰

[25] الانفال: ۶۶

[26] البقرہ: ۳۴

اور دوسرے مقام پر شیطان کے متعلق فرمایا:

"كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ "[27]

"وہ جنّات میں سے تھا تو اس نے اپنے ربّ کے حکم کی نافرمانی کی"

ان آیات کی روشنی میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ قرآن مجید میں ایک مقام پر ابلیس کو فرشتہ کہا گیا اور دوسرے مقام پر جن ّجبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بے دلیل بات ہے۔ شیطان کی اصل کے بارے میں اگرچہ طویل مباحث موجود ہیں لیکن بعض اصولی باتوں کی روشنی میں حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ فرشتوں کے متعلق یہ واضح فرمایا گیا:

"لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ"[28]

"وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو انہیں حکم دیا جائے وہی بجالاتے ہیں"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور پھر کان من الجن ّتو نص ہے کہ وہ جنّوں میں سے تھا۔ یہاں تک سطورِ بالا میں مذکور سورۃ البقرہ کی آیت ۳۴ کا تعلق ہے تو اس میں شیطان کا فرشتوں سے استثناء کیا گیا ہے۔ وہاں یہ تو نہیں کہا گیا کہ وہ فرشتوں میں سے تھا، صرف یہ فرمایا گیا کہ فرشتوں نے سجدہ کیا، ابلیس نے نہیں کیا۔ استثناء تو متصل بھی ہو سکتا ہے اور منقطع بھی۔ تو یہاں واضح نصوص کا تقاضا ہے کہ اس سے مراد مستثنیٰ منقطع لیا جائے کہ یہ فرشتوں میں سے نہیں تھا لیکن چونکہ فرشتوں کے ساتھ عبادت کرتا تھا تو جو حکم اعلیٰ کو دیا جائے، ادنیٰ اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہوتا ہے۔ جس کی تعظیم بادشاہ کرے گا، رعایا پر اس کی تعظیم بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گی۔ چنانچہ جب فرشتوں کو حکم دیا گیا تو شیطان بدرجہ اولیٰ اس حکم میں شامل ہو گیا۔ اس آیت سے اس کی سرکشی ثابت ہوتی ہے۔ اس کا فرشتوں میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ یہاں مستثنیٰ متصل نہیں منقطع ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سجدہ کے حکم میں جنّات بھی شامل ہوں۔

"لکنہ استغنی عن ذکرھم بذکر الملائکۃ لان الاکابر لما امروا بالسجود فالاصاغر اولیٰ"[29]

"لیکن فرشتوں کے ذکر کے بعد جنون کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہ رہی کیونکہ جب اکابر کو سجدے کا حکم دیا گیا تو اصاغر اس میں بدرجہ اولیٰ شامل ہو گئے"

اس بحث میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"و الراجح لدی القول الاول لصریح آیۃ کان من الجن والأنّ ابلیس قدعصی امر ربہ و الملائکۃ لا یعصون اللہ ما امرھم"[30]

"اور میرے نزدیک راجح قول پہلا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا کیونکہ اس پر صریح آیت دلیل ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا اور ابلیس نے تو اپنے ربّ کی نافرمانی کی اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا اور ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی یا پانی سے؟:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا"[31]

"اور وہ وہی ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا"

دوسرے مقام پر فرمایا:

"هوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ"[32]

"وہ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا"

---

[27] الکہف:۵۰

[28] التحریم:۶

[29] دریا آبادی، تفسیر مظہری، ج ا، ص ۶۶

[30] وھبہ زحیلی، ڈاکٹر، التفسیر المنیر، مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ، ۱۴۳۲، ج ا، ص ۱۴۶

[31] الفرقان: ۵۴

[32] الانعام:۲

ان آیات کی روشنی میں بھی قرآن میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا کہ ایک مقام پر کہا کہ انسان کی تخلیق پانی سے ہوئی اور دوسرے مقام پر فرمایا کہ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی حالانکہ ان آیات میں تضاد نام کی کوئی چیز بالکل نہیں ہے کیونکہ حضرت آدم علیہا السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور پھر تمام انسانوں کی تخلیق قطرہ آب سے ہوئی یہاں خلقکم سے مراد ہے

"بخلق ابیکم آدم منہ"[33]

"تمہارے باپ آدم علیہا السلام کو مٹی سے پیدا کر کے"

یعنی خَلَقَکُمْ سے مراد ہے خلق اباکم کہ تمہارے باپ آدم علیہا السلام کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر بعد میں نسل انسانی قطرہ آب سے چلی یعنی پہلی آیت میں عام انسانوں کی تخلیق کا ذکر ہے جو مشاہداتی طور پر بھی بالکل واضح ہے اور دوسری آیت میں تخلیق آدم علیہا السلام کا ذکر ہے جس کی خبر قرآن وسنت میں دی گئی کہ انہیں مٹی سے پیدا کیا گیا۔

ان آیات میں تطبیق کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کی تخلیق قطرہ آب سے ہوتی ہے جو خوراک سے بنتا ہے اور خوراک مٹی سے پیدا ہوتی ہے تو قطرہ آب انسان کی تخلیق کا سبب قریب ہے اور مٹی سببِ بعید۔ تو پہلی آیت میں سببؐ قریب کا ذکر ہے اور دوسری آیت میں سببِ بعید کا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب لوگوں سے کلام کرے گا یا نہیں؟:

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت کے بدلہ میں بیچ دیا ان کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں پھر فرمایا:

"وَلاَ يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلاَ يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلاَ يُزَكِّيْهِمْ"[34]

"قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

"فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ"[35]

"تو آپ کے رب کی قسم! ہم سب سے ان کے اعمال کے متعلق پوچھیں گے"

ان دونوں آیات کے متعلق بھی تضاد کا دعویٰ کیا گیا اور کہا گیا کہ پہلی آیت میں منکرین سے اللہ تعالیٰ کے کلام کرنے کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت سب سے کلام کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی ان آیات میں تضاد ہے۔ جبکہ درحقیقت ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے یا تو اس لیے کہ یہاں جس کلام کی نفی ہے وہاں کلام محبت والطاف مراد ہے اور یہاں کلام کا اثبات ہے، وہاں کلام غضبی مراد ہے جو منکرین کے لیے اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کا اظہار ہو گا یا یہاں کلام کی نفی ہے، وہاں اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا بلاواسطہ کلام کرنا ہے اور یہاں کلام کا اثبات ہے، وہاں فرشتوں کی وساطت سے اللہ تعالیٰ کا کلام کرنا مراد ہے۔ امام بیضاوی لاَ يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"بما یسرھم اوبشئی اصلا و ان الملائکۃ یسئلونھم یوم القیامۃ اولاینتفعون بکلمات اللہ و آیاتہ والظاہر انہ کنایۃ عن غضبہ علیھم"[36]

"یعنی اللہ تعالیٰ ان سے ایسا کلام نہیں کرے گا جو انہیں خوش کرے یا اللہ تعالیٰ ان سے بالکل کلام نہیں کرے گا اور قیامت کے دن ان سے سوال فرشتے کریں گے یا وہ اللہ تعالیٰ کے کلمات اور اس کی آیات سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور ظاہر ہے یہ ان کے لیے غضب الٰہی کا کنایہ ہے"

مراد یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ یہاں نفی ایسے کلام کی ہے جو انہیں خوش کرے جبکہ ان سے سوال کرنا تو انہیں عذاب دینے کے لیے ہو گا یا اللہ تعالیٰ ان سے بالکل کلام نہیں کرے گا اور ان سے سوال فرشتے کریں گے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنا کوئی حکم کارندوں کے ذریعے سے اپنی رعایا تک پہنچائے اور پھر کہے کہ ہم نے اپنی رعایا کو یہ حکم دیا ہے، یہی اسلوب یہاں اختیار کیا گیا ہے۔ ان سے ایسے کلام کی نفی ہے جو انہیں فائدہ دے اور سوال کرنے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ نقصان ہو گا۔ اس سے ان آیات میں تطبیق واضح ہوتی ہے۔

زمین و آسمان الگ الگ تھے یا ملے ہوئے؟:

قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

---

[33] السیوطی، جلال الدین، تفسیر جلالین، ج ۱، ص ۱۶۲

[34] آل عمران: ۷۷

[35] الحجر: ۹۲، ۹۳

[36] بیضاوی، ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر، انوار التنزیل واسرار التاویل، ج ۱، ص ۱۷۱

"ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلۡاَرۡضِ ائۡتِيَا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا"[37]

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھوئیں کی شکل میں تھا اور اس نے اس سے اور زمین سے کہا چلے آؤ چاہے خوشی سے یا نا گواری سے "

دوسرے مقام پر فرمایا:

"اَوَلَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا"[38]

"جن لوگوں نے کفر کیا، کیا انہوں نے کبھی آسمانوں اور زمین میں غور نہیں کیا کہ وہ باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں کھول دیا"

ان آیات کی روشنی میں بھی تضاد کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا گیا کہ پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ زمین و آسمان الگ الگ تھے اور دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ وہ ملے ہوئے تھے لہٰذا قرآن کا بیان متضاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں زمین و آسمان کے تخلیقی مراحل کے اعتبار سے بات کی گئی ہے۔ ان میں تضاد نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ رتق کا لفظی معنی ہے دو چیزوں کا بند یا ملا ہوا ہونا۔ زمین و آسمان کے بند یا ملے ہوئے ہونے سے مراد یا تو یہ ہے کہ آسمان سے بارش نہیں برستی تھی اور آسمان سے سبزہ نہیں اگتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بارش برسائی اور زمین سے سبزہ اُگایا۔ یہ ضحاک عکرمہ اور مجاہد کا قول ہے۔ اس صورت میں تو دعویٰ تضاد کی کوئی صورت ہی نہیں بنتی۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان پہلے ملے ہوئے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں الگ کر دیا۔

"کان الجمیع متصلاً بعضہ ببعض متلاصق متراکم بعضہ فوق بعض فی ابتداء الامر ففتق هذه من هذه فجعل السموات سبعا و الارض سبعا"[39]

"ابتداء میں زمین و آسمان ملے ہوئے اور ایک دوسرے کے اوپر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں الگ الگ کر کے سات آسمان اور سات زمینیں بنادیا"

اس صورت میں بھی یہاں تضاد کی کوئی صورت نہیں ہے کہ وہ پہلے ملے ہوئے تھے پھر انہیں الگ الگ کرکے حکم دیا۔ تو اس میں تضاد کہاں سے آ گیا؟

کیا اللہ کے سوا کوئی دوست یا مددگار ہے؟:

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ"[40]

"اور اللہ کے سوا نہ تمہارا کوئی دوست ہے نہ مددگار"

جبکہ ایک اور مقام پر فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اپنا رب مانتے ہیں اور راہِ استقامت اختیار کرتے ہیں تو ان پر فرشتے اترتے ہیں جو انہیں خوف و حزن سے آزادی اور جنت کی بشارت دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں:

"نَحۡنُ اَوۡلِيٰٓـؤُكُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَفِى الۡاٰخِرَةِ"[41]

"کہ ہم دنیا اور آخرت میں تمہارے دوست ہیں"

ان آیات کے متعلق کہا گیا کہ پہلی آیت میں اللہ کے سوا کسی کی دوستی کی نفی ہے جبکہ دوسری آیت میں فرشتوں کی دوستی کا اثبات ہے لہٰذا اس تناظر میں قرآن مجید کا بیان مختلف ہے۔ حالانکہ ان آیات کا مطلب بالکل واضح ہے۔ یہاں کافروں کے لیے جس دوستی کی نفی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ہے کہ جب عذاب الٰہی آئے گا تو کوئی تمہارا دوست نہیں ہو گا جو تمہیں اس عذاب سے بچا سکے۔

"یمنعکم منہ و ینصرکم من عذابہ"[42]

"جو تم سے عذاب دور کرے اور عذاب الٰہی میں تمہاری مدد کرے"

---

37 حم السجدہ:۱۱

38 الانبیاء:۳۰

39 ابن کثیر، تفسیر القران العظیم، القاہرہ، دارالحدیث، ۱۹۹۵، ج۳، ص ۱۷۲

40 العنکبوت: ۲۲

41 حم السجدہ: ۳۱

42 السیوطی، جلال الدین، تفسیر جلالین، ج۴، ص ۳۱۳

اور مومنوں کے لیے فرشتوں کی جس دوستی کا اثبات ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو نعمت کے طور پر دی ہے:

"کما ان الشیاطین قرناء العصاۃ و اخوانھم فکذلک الملائکۃ اولیاء المتقین"

مراد یہ ہے کہ جیسے گنہگاروں پر شیاطین مسلط کر کے ان کے ساتھی اور بھائی بنا دیے جاتے ہیں ایسے ہی اللہ تعالیٰ فرشتوں کو نیک بندوں کے دوست بنا دیتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ کافروں کے لیے جس دوستی کی نفی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں مدد کرنے والی دوستی ہے اور اہل ایمان کے لیے فرشتوں کی جس دوستی کا ذکر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہی بنانے سے ہے۔ اس لیے ان آیات میں کوئی تضاد نہیں

قیامت کے دن مجرموں کو نامہ اعمال کیسے دیا جائے گا؟:

قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

"وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ"[43]

"رہا وہ شخص جسے اس کا نامہ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا جائے گا"

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

"وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ"[44]

"اور رہا وہ شخص کہ جسے اس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا"

پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ اسے نامہ اعمال پشت کے پیچھے سے دیا جائے اور دوسری آیت میں فرمایا کہ مجرم کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ چنانچہ معترض کا خیال ہے کہ یہاں اس تناظر میں قرآن مجید کا بیان متناقض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ نامہ اعمال بائیں ہاتھ کو پشت کے پیچھے کر کے بھی دیا جا سکتا ہے۔ علامہ زمخشری مجرم کو نامہ اعمال دینے کی حالت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قیل تغل یمناہ الی عنقہ و تجعل شمالہ وراء ظھرہ فیوتی کتابہ بشمالہ من وراء ظھرہ"[45]

"ایک قول یہ ہے کہ اس کا دایاں ہاتھ گلے کا طوق بنا دیا جائے گا اور بایاں ہاتھ پشت کی طرف لے جا کر اس میں نامہ اعمال تھما دیا جائے گا"

مجاہد کہتے ہیں:

"یجعل شمالہ وراء ظھرہ فیاخذبھا کتابہ"[46]

"اس کا بایاں ہاتھ اس کی پشت کے پیچھے کیا جائے گا اور پھر اسے اس کا نامہ اعمال دیا جائے گا"

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں:

"تغل یمناہ الی عنقہ و تجعل یسرہ وراء ظھرہ فیاخذ بھاکتابہ"[47]

"اس کا دایاں ہاتھ گلے کا طوق بنا دیا جائے گا اور اس کا بایاں ہاتھ اس کی پشت کے پیچھے کر دیا جائے گا۔ اس طرح وہ اپنا نامہ اعمال پکڑے گا"

مفسرین کی ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے اور ان میں تطبیق کو عقل سلیم بھی بخوبی سمجھ سکتی ہے۔

موت دو بار ہے یا تین بار:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ"[48]

"تم اللہ تعالیٰ کا انکار کیسے کر سکتے ہو حالانکہ تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا، پھر وہ تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا اور پھر تم اس کے پاس لوٹائے جاؤ گے"

---

[43] الانشقاق: ۱۰

[44] الحاقۃ: ۲۵

[45] زمخشری، ابوالقاسم محمود بن عمر، تفسیر الکشاف، ج۴، ص ۷۲۷

[46] دریا آبادی، تفسیر مظہری، ج۷، ص۳۷۶

[47] السیوطی، جلال الدین، تفسیر جلالین، ج۶، ص ۲۵۲

[48] البقرہ:۲۸

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ"[49]

"اے ہمارے رب! تونے ہمیں دو مرتبہ موت دی اور دو مرتبہ زندگی دی"

ان آیات کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا کہ پہلی آیت سے دو زندگیاں اور تین بار موت ثابت ہے اور دوسری آیت سے دو بار موت اور دو بار زندگی ثابت ہے۔اس سے قرآن مجید کے متن میں تضاد کا دعویٰ کیا گیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ بالکل بے حقیقت اور بہت ہی سطحی سی بات ہے۔ان دونوں آیات میں ایک ہی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان آیات پر متعدد پہلوؤں سے طویل مباحث موجود ہیں لیکن ان دونوں آیات کا مدار ایک ہی حقیقت کو بیان کرتا ہے اور وہ قدرت باری تعالیٰ کا اظہار ہے۔ حضرت ابن مسعود، ابن عباس اور قتادیٰ کا قول یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ذکر ہے۔ پہلی موت حالت عدم اور دوسری موت دنیوی زندگی کے بعد کی موت اور پہلی زندگی دنیا کی زندگی اور دوسری زندگی مرنے کے بعد کی زندگی یعنی خواہ وہ کسی بھی مرحلہ کی ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ آیت کریمہ: رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ سے متعلق فرماتے ہیں:

"هذه الآية كقوله تعالى كيف تكفرون بالله و كنتم امواتا فاحياكم ثم يميتكم ثم يحيكم ثم اليه ترجعون و كذا قال ابن عباس والضحاک و قتاده و ابومالک وهذا هو الصواب الذى لا شک فيه ولامرية"[50]

"یہ آیت بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا انکار کیسے کروگے کہ تم مردہ تھے، اس نے تمہیں زندہ کیا پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ حضرت ابن عباس، ضحاک، قتادہ اور ابو مالک کا یہی قول ہے یہی درست ہے جس میں کوئی شک وشبہ نہیں"

اگرچہ دو موتوں اور دو زندگیوں کی تعبیر مختلف بھی کی گئی ہے لیکن دونوں آیات میں دو موتوں اور دو زندگیوں کا ہی ذکر ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان آیات میں کوئی تضاد نہیں۔ ان تمام مباحث سے یہ حقیقت بالکل واضح اور عیاں ہو جاتی ہے کہ ان تیس مقامات پر تضاد کا دعویٰ ایک بے حقیقت بات ہے۔ قرآن مجید ہر قسم کے تضاد سے بالکل محفوظ اور مبرا ہے۔اب ان تمام مقامات کا خلاصہ ملاحظہ ہو تاکہ حقیقت سمجھنے میں مزید آسانی ہو۔

---

[49] المؤمن: ۱۱

[50] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۴، ص ۴۷